قاضی فرزانہ تبسم ★

مقاصد شریعت نصوص کی روشنی میں

انسان کی پیدائش کا مقصد بندگی رب ہے۔ انسان بندگی کا حق کس طرح ادا کرسکتا ہے، اس کے لیے اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعے مختلف زمانوں میں شریعتیں بھیجیں۔ آخری اور کامل شریعت حضرت محمد مصطفیٰؐ کے ذریعے سے نازل فرمائی۔ اب قیامت تک آنے والا ہر انسان رضائے الٰہی حاصل کرکے اصل اور حقیقی (اُخروی) خسران سے صرف اور صرف دین وشریعت محمدیؐ کو اختیار کرکے ہی بچ سکتا ہے۔

غرض کہ دین وشریعت محمدیؐ کے نزول کا واحد مقصد یہ ہے کہ انسان اُخروی خسران سے بچے اور رضائے الٰہی وفلاح آخرت حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے۔ چنانچہ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ نہ صرف اپنے طرز فکر وعمل سے دین وشریعت کا تحفظ کرے، بل کہ بغیر کسی کتر بیونت کے پورے اخلاص اور تن دہی کے ساتھ اس کی اقامت کی جدوجہد کرے۔ نہ کہ باطل اور غیر اسلامی نظریات اور قوتوں کے غلبے سے متاثر اور مرعوب ہوکر اجتہاد ومقاصد شریعت کے حصول کے نام پر دین وشریعت میں کاٹ چھانٹ کرکے ان نظریات اور قوتوں کے لیے موافق یا غیر مزاحم بنانے کی کوشش کرے۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک طرف جس دور انحطاط سے ملت اسلامیہ گزر رہی ہے، اس کی مثال تاریخ اسلام میں نہیں ملتی تو دوسری طرف غیر اسلامی اور باطل افکار اور قوتوں کی مادی ترقی اور غلبے اور اسلام اور عالم اسلام کے خلاف پیہم چوطرفہ یلغار کی مثال بھی ماضی میں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ عام مسلمان ہی نہیں، بل کہ علما اور دانشوروں کا ایک طبقہ بھی بُری طرح مرعوب ومتاثر اور معذرت خواہ نظر آتا ہے۔ اس طبقے کے بعض علما اور دانشوروں کی طرف سے

★ 33/A، لاجپت رائے کالونی، باغ دل کشا، بھوپال، فون: 08605710175

'اجتہاد' اور 'حصول مقاصدِ شریعت' کے نام پر ایسی تحریریں اور تصانیف منظر عام پر آرہی ہیں، جن سے دین و شریعت میں تحریف کا دروازہ وا ہوتا ہے۔ حال ہی میں 'مقاصد شریعت' کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے، جس کے مصنف ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی ہیں۔ کتاب میں بہت سی مفید باتیں بھی ہیں لیکن ایسے مباحث اور تجاویز بھی ہیں جو قابل رد ہیں۔ موصوف عورت کے سر ڈھانکنے کو بھی عرب ماحول کے سیاق میں پایا جانے والا ایک رواج قرار دیتے ہیں، جس کی پابندی کم از کم مغرب میں رہنے والی مسلمان عورت کے لیے ضروری نہیں۔ (مقاصد شریعت'ص:۱۹۵)

چند فقہاء و علماء کے نزدیک مسلم عورت کے چہرے کا پردہ ضروری نہیں ہے۔ خاص طور پر جب کہ فتنے کا اندیشہ نہ ہو۔ لیکن کچھ عرصے سے بعض مسلم دانشوروں کے نزدیک پردہ ہی ناقابل قبول ہونے لگا ہے۔ اسے انھوں نے ازواج مطہرات کے لیے مخصوص کردیا اور اب تو عورت کے سر سے دوپٹا بھی اتار پھینکا جارہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب عورت کے حجاب اور پردے کے سرے سے قائل ہی نہیں ہیں۔ لہٰذا وہ آیت جس میں تمام عورتوں بشمول ازواج مطہرات کو اوپر سے چادر ڈالنے کا حکم ہے 'اے نبی! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلّو لٹکا لیا کریں۔' (الاحزاب:۵۹) اس آیت کا تذکرہ کرتے وقت بھی صریح طور سے 'مسلمانوں کی عورتوں' یہ الفاظ ہی حذف کردیے۔ ملاحظہ فرمائیں:

> 'دوسری آیت جس میں ازواج مطہرات کو گھر سے باہر نکلنے کے لیے جلباب نیچے کو لینے کی ہدایت ہے۔' (ص:۱۹۴)

عورت کے حجاب اور پردے سے متعلق موصوف مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ 'مسلم عورت کے حجاب کا مسئلہ مغربی ممالک سے ٹکراؤ و محاذ آرائی کا سبب بن رہا ہے۔ لہٰذا' اس فروعی اور اختلافی مسئلے پر محاذ آرائی اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہے۔' (ص:۱۹۵) ان کا کہنا ہے کہ مسلم عورت کے سر ڈھانپنے کے سلسلے میں قرآن میں حکم نہیں ہے۔ فرماتے ہیں:

> 'چنانچہ جس آیت قرآنی میں عورت کے لباس کا ذکر ہے اس میں خمار کو سینے پر ڈالنے کا کہا گیا ہے۔' (ص:۱۹۴)

اس سلسلے میں اولاً تو یہ کہ قرآن میں عورت کے لباس کا کہیں ذکر ہی نہیں ہے کہ کیا پہنو

اور کیا نہ پہنو۔ ثانیاً یہ کہ قرآن میں عبادات وغیرہ کے اور دیگر کچھ احکام و مسائل بھی ایسے ہیں جو اجمالاً بیان کیے گئے ہیں، جن کی تفصیل ہمیں حدیثوں کے ذریعے ملتی ہے۔ جیسے قرآن میں نماز پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے، نماز کے اوقات بتائے گئے ہیں، لیکن طریقہ نہیں بتایا گیا۔ نماز کا طریقہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے اور جو بتواتر آج تک چلا آ رہا ہے۔ سورۂ النور میں محرم مردوں کی فہرست میں جن کے سامنے ایک عورت پوری زیب و زینت کے ساتھ آ سکتی ہے، چچا اور ماموں کا ذکر نہیں کیا گیا۔ تو کیا قرآن کی رو سے حقیقی چچا اور ماموں ایک عورت کے لیے غیر محرم ہو گئے، جن سے ایک مسلم عورت کو غیر محرموں کا سا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ اسی طرح قرآن میں دوپٹے کے بارے میں بھی اجمالاً اشارہ ہے کہ دوپٹا سینے پر بھی ڈالا جائے کہ پہلے عورتیں سر کو کساوے سے باندھتی تھیں اور سینہ وغیرہ سب کھلا رہتا تھا۔ سوائے قمیص کے، اس کے اوپر کچھ نہ ہوتا تھا۔ لہٰذا قرآن میں یہی کہا گیا کہ سر کے ساتھ ساتھ سینے وغیرہ کو بھی چھپایا جائے اور پھر حدیث کے ذریعے ہمیں اس حکم کی مزید تفصیل بھی مل گئی۔ آپؐ نے فرمایا:

لایحل الامرأۃ تؤمن باللہ والیوم الآخر ان تخرج یدیھا الا الیٰ
ھٰھنا وقبض نصف الذراع' (ابن جریر)

'کسی عورت کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہو، جائز نہیں کہ وہ اپنا ہاتھ اس سے زیادہ کھولے، یہ کہہ کر آپؐ نے اپنی کلائی کے نصف حصے پر ہاتھ رکھا۔'

مزید ارشاد ہے:

الجاریۃ اذا حاضت لم یصلح ان یریٰ منھا الا وجھھا ویدھا الی المفصل (ابوداؤد)

'جب عورت بالغ ہو جائے تو اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر نہ آنا چاہیے، سوائے چہرے اور کلائی کے جوڑ تک ہاتھ کے۔'

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

'میں اپنے بھتیجے کے سامنے زینت کے ساتھ آئی تو نبیؐ نے اس کو ناپسند فرمایا۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ تو میرا بھتیجا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: جب عورت بالغ ہو جائے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ اپنے جسم میں سے کچھ ظاہر کرے سوائے چہرے کے اور

> سوائے اس کے۔ یہ کہہ کر آپؐ نے اپنی کلائی پر اس طرح ہاتھ رکھا کہ آپ کی گرفت کے مقام اور ہتھیلی کے درمیان صرف ایک مٹھی بھر جگہ باقی تھی۔'

اس مضمون کی احادیث، حدیث کی بہت سی کتابوں میں بہ کثرت ملتی ہیں۔ اب جب کہ عورت کو ہتھیلی اور چہرہ چھوڑ کر جسم کے کسی حصے کو گھر میں بھی کھولنے کی اجازت نہیں دی گئی تو کیا سر عورت کے جسم کا حصہ نہیں ہے، جسم کے باہر کا کوئی عضو ہے؟ اور کیا ان حدیثوں کا اطلاق سر پر نہیں ہوتا ہے۔ اگر شریعت میں سر کو کھلا رکھنے کی اجازت ہوتی تو رسول اکرمؐ اس کی بھی وضاحت فرما دیتے کہ 'سر، چہرہ اور ہتھیلی کو چھوڑ کر پورا جسم چھپاؤ۔' آگے فرماتے ہیں: 'جہاں عرف وعادت مختلف ہوں، وہاں کے لیے اصل دین اور مقاصد شریعت کو سامنے رکھ کر سوچا جائے۔'

سوال یہ ہے کہ مختلف مقامات کے مختلف عرف اور عادات کا لحاظ کر کے کن احکام کے مقاصد کو سامنے رکھ کر آپ سوچیں گے اور ان کے کیا مقاصد تجویز کریں گے؟ اور تحریم وتحلیل کے قانون بنائیں گے؟ اور قرآن وسنت کے حرام کردہ کن کن امور کو آپ اسی طرح اپنے طور سے مقاصد شریعت تجویز کر کے یا انھیں عرب کا عرف وعادت قرار دے کر حلال کرلیں گے؟

افسوس کہ محترم موصوف نہ صرف مسلم عورت کے پردے اور حجاب کی نفی کرتے ہیں، بل کہ آگے بڑھ کر مسلم عورتوں کے غیر مسلم مردوں سے ربط واختلاط کے نہ صرف یہ کہ زبردست مؤید ہیں، بل کہ ان کے نزدیک مسلم عورت کے غیر مسلم مردوں سے روابط نہ ہونے کے سبب اپنے فریضے (اقامت دین) کے تقاضے پورے کرنا اس کے لیے ناممکن ہے۔ فرماتے ہیں:

> 'عورت کا مقام گھر کے اندر ہے، جیسے کلیے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلم انسانیت بشمول ان کی عورتوں کے (خصوصاً مردوں اور عموماً عورتوں سے۔ (راقم) مسلمان عورت کا کوئی ربط باقی نہ رہا۔ ایسی حالت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمان عورت اپنے آپ کو درج ذیل آیات کی مخاطب سمجھے اور ان کے تقاضے پورے کرنے کی کوشش کرے۔'
>
> (ص ۵۷، ۵۸)

ڈاکٹر صاحب نے 'زندگی نو' اکتوبر ۲۰۰۹ء میں شائع شدہ اپنے مضمون 'جماعت اسلامی ہند کو درپیش چیلنجز' میں بھی یہی بات فرمائی ہے: 'البتہ یہ کہنا ضروری ہے کہ جو کچھ ہوا اس کے نتیجے میں ہندستان میں مسلمان عورت غیر مسلم انسانیت سے کٹ گئی۔' (غور کریں یہاں بھی غیر مسلم

عورتیں نہیں کہا۔ بل کہ انسانیت کہا کہ اس میں مردوں کو شامل کرنا جو تھا۔ بل کہ مردوں کے لیے بطور خاص یہ بات کہی گئی) (راقم) ملک کے مسلمان غیر مسلم انسانیت سے تعامل میں اپنی آدھی طاقت سے محروم ہو گئے۔ اب انسانیت عامہ تک اللہ کا پیغام اپنے قول وعمل سے پہنچانے میں مسلمان عورت عضوِ معطل ہو کر رہ گئی۔ کیا یہ آدھی گواہی اللہ کو قبول ہو گی۔' (ص: ۳۰، ۳۱)

یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ اسلام نے بہت سارے معاملات میں عورت کو مرد کے برابر حقوق عطا کیے ہیں۔ لیکن گھر کے نظام کو بہترین طریقے سے چلانے اور برقرار رکھنے کی خاطر مرد کو عورت پر قوام بنایا۔ گھر کے سربراہ کی حیثیت عطا کی۔ ساتھ ہی اس پر ذمے داریوں کا بھی کافی بوجھ ڈال دیا۔ جس طرح کسی ملک یا علاقے یا کسی قبیلے کا کوئی سربراہ نہ ہو تو اس کا نظام قائم ہی نہیں ہو سکتا، اسی طرح گھر کا شعبہ بھی کسی نہ کسی سربراہی کا محتاج ہے۔ سو وہ سربراہی مرد کی فطری وجسمانی ساخت اور دیگر صلاحیتوں کے لحاظ سے اسے ہی عطا ہوئی۔ اسی میں حکمت خداوندی ہے۔ وہ بھی محتاج بیان نہیں ہے اور پھر یہ کہ قرآن نے خاندان کی قوامیت وسربراہی مرد کو عطا کر کے اس پر تمام عائلی قوانین واحکام کی بنیاد رکھی ہے اور مغرب کا نظریہ مساوات (مرد وعورت سے متعلق) اسلام کے عائلی قوانین کی اس بنیاد کو ڈھا کر ہی قائم کیا جا سکتا ہے۔ جس کے نتیجے میں دین کی بنیاد ہی متزلزل ہو جائے گی۔ ارشاد خداوندی ہے:

> الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (النساء: ۳۴)

مزید ارشاد ہے:

> 'عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ فوقیت حاصل ہے اور سب پر اللہ غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم ودانا ہے۔' (البقرۃ: ۲۲۸)

اس ضابطۂ خداوندی پر موصوف کا طنز ملاحظہ فرمائیں:

> 'اس نمونے کے ڈھانچے میں مسلمان گھرانے میں مرد حاکم ہوتا ہے اور عورت تابع مطلق۔ گویا یہ کائنات مردوں کی آماجگاہ ہے اور عورتیں مردوں کے لیے بنائی گئی۔'
> (مقاصد شریعت، ص: ۵۹)

قرآن کریم کی رو سے بھی مرد صاحب امر اور عورت مرد کی مطیع قرار دی گئی ہے اور

احادیث کے ذریعے بھی عورت پر شوہر کی اطاعت واجب کردی گئی۔ یہ جو قاعدہ ہے کہ مرد سربراہ اور عورت اس کی مطیع ہے، قرآن وسنت کا مقرر کردہ ہے۔ فقہاء کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ موصوف اسے ایک طرف تو جزئی وفقہی قرار دے رہے ہیں جو ابتدائی زمانے کے عربوں کے عرف وعادت کا لحاظ کرکے رکھا گیا تھا اور دوسری طرف یہ بھی فرما رہے ہیں کہ قرآن کی طرف سے انھیں دوام کی سند حاصل نہیں ہے۔ ساتھ ہی نیا ضابطۂ آداب مرتب کرنے کا مشورہ بھی دیا جارہا ہے۔ موصوف اس بات کے بھی قائل ہیں کہ یہ قاعدہ قرآن کریم کے ذریعے بنایا گیا ہے۔ لیکن ان کے نزدیک قرآن کریم نے مذکور اس قاعدے کو دوائی نہیں عارضی حیثیت دی ہے۔ اب رہا وہ قاعدہ جسے قرآن کریم میں کتنے عرصے کے لیے مقرر کیا گیا تھا، صحیح مدت اور اسے عارضی حیثیت جس آیت نے دی اس کی نشاندہی تو موصوف ہی کرسکیں گے۔

اس بات پر کہ غیر مسلم مرد مسلم عورتوں کے لیے حرام ہے۔ خلفاے راشدین وصحابہ کرام سے اجماع وتواتر کے ساتھ چلا آرہا ہے۔ لیکن محترم نہ صرف غیر مسلم زوجین میں سے کسی ایک کے ایمان لانے پر نکاح قائم رکھنے کے قائل ہیں بل کہ تجدد پسند دانشور ڈاکٹر حسن ترابی کے حوالے سے فرماتے ہیں:

> 'ماضی کے سارے فتاویٰ جن میں مسلمان عورت کی غیر مسلم مرد سے شادی ممنوع قرار دی گئی تھی، ایسے زمانے میں جاری کیے گئے تھے، جب مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی جھگڑے چل رہے تھے۔ دوسری طرف مجھے قرآن یا سنت میں ایک لفظ بھی نہ ملا جو ایسی شادیوں کو ممنوع قرار دیتا ہو۔'' ہمیں ان مسلمان اقلیتوں کو جو مغرب میں اہل کتاب کے درمیان رہتے ہیں اختیار دینا چاہیے کہ وہ اس مسئلے کا جائزہ لے کر فیصلے کریں کہ کیا طریقہ مناسب ہوگا کیوں کہ وہی اس سے اولین مرحلہ میں متاثر ہوتے ہیں۔ وہ اس نتیجے تک پہنچیں گے کہ اپنی بیٹیوں کو عیسائی اور یہودی مردوں کے ساتھ شادیاں کرنے دیں کیوں کہ غالباً یہ شادیاں ان کے شوہروں کو اسلام کی طرف لے آئیں گی، بصورت دیگر عورت خود اسلام پر قائم رہ سکے گی۔' (ص: ۱۷۸)

اس طرح مزید دو ایک رائے نقل کرنے کے بعد مصنف تائیداً فرماتے ہیں:

'آپ نے دیکھا کہ ایک نیا موقف اختیار کرنے والوں نے کس طرح نئے حالات

میں اسلام کے اس مقصد کو کہ اللہ کے بندے راضی وخوشی کے ساتھ اللہ کے دین میں داخل ہوسکیں اور ان کو اس پر قائم رہنے میں ناقابل برداشت مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے، فیصلہ کن اہمیت دی۔' (ص:۹ے تا ۱۸۰)

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک قرآن وسنت یعنی احکام شریعت پر غوروفکر کرکے کسی فیصلے پر پہنچنا عام لوگوں کا بھی کام ہے۔ صرف علما وفقہا کا نہیں۔ اور عام لوگوں کو بھی اس کی آزادی ملنی چاہیے کہ وہ اپنے اپنے حالات کے مطابق احکام شریعت کے فیصلے کرسکیں۔ جس کی تلقین پوری کتاب میں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہے۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

'کچھ لوگ سوچ سکتے ہیں کہ وہ صورت حال اس سے بہتر ہے جو صدیوں سے قائم چلی آرہی ہے۔ یعنی نئے پیش آمدہ مسائل میں اجتہادی کوشش کو امت کے علماء اور فقہاء کا کام قرار دیا جائے اور باقی لوگوں کو اس بات پر قانع رکھا جائے کہ ان کا کام سمع و طاعت ہے۔ یہ سوچ درست نہیں، اس کی پہلی غلطی یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کو ایک ایسے عمل میں شرکت سے محروم کرنا چاہتی ہے، جس میں حصہ لینا ان کا صرف حق نہیں، بل کہ ان کی ذمے داری ہے۔ اس طرز فکر کا تیسرا نقصان یہ ہے کہ اس سے متاثر ہوکر مبتلا افراد تو پیچھے ہٹ جائیں گے مگر ان لوگوں کی اجتہادی کوششوں پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا جو موجودہ زمانے کے علما اور فقہا کے کام سے مطمئن نہیں اور زمانے کے دباؤ کے تحت نئی سوچ کے عمل میں کافی آگے جاچکے ہیں۔' (ص:۱۶۴، ۱۶۵)

قرآن پر غوروفکر الگ بات ہے اور اجتہاد کے ذریعے کوئی فیصلہ کرلینا اور اس کا پوری امت بشمول علما وفقہا تک کے لیے قابل قبول ہوجانا بالکل دوسری بات ہے۔ زمانہ سلف سے ہی یعنی عہد خلفاے راشدین کے بعد سے ہی یہ طریقہ چلا آرہا ہے کہ قرآن وسنت پر غوروفکر تو امت کا ایک بڑا طبقہ کرتا رہا ہے، لیکن جن کے اجتہاد کو قبول عام حاصل ہوا، ان کی تعداد شاذ رہی۔ جنھوں نے اپنی پوری زندگی قرآن وحدیث اور فقہ وشریعت اسلامی کے مطالعے اور تحقیق میں گزاردی اور برسوں کی اس تحقیق اور مطالعہ وممارست نے ان کے اندر وہ گہری بصیرت وملکہ پیدا کردیا کہ وہ رسول اللہ کے مزاج شناس ہوگئے۔ جن کے خلوص اور دینی بصیرت پر دیگر تمام خاص وعام کو اعتماد رہا اور اخلاق وکردار اور پابندی شریعت کے لحاظ سے بھی ان کا نہایت اعلیٰ مقام رہا۔

ایسے ہی حضرات نت نئے مسائل یعنی ایسے مسائل جن سے ماقبل سابقہ پیش نہ آیا ہو اور دیگر مسائل سے متعلق بھی (واضح رہے اجماع ہی ہے) قرآن وسنت اور تاریخ وسیرت وصحابہ اور علمائے سلف و خلف کے مطالعہ، تحقیق واجتہاد کے ذریعے نیز کن حالات میں رسول کریم، صحابہ کرام وعلمائے سلف و خلف کے کس قسم کے خیالات اور رویے رہے ہیں۔ ان پر تحقیق کرکے بھی اپنے فیصلوں سے عوام الناس کو مستفید کرسکتے ہیں۔ خداوند کریم کا بھی ارشاد ہے: 'اگر تم علم نہیں رکھتے تو اہل ذکر سے پوچھ لو۔' (النحل: ۴۳) ان کے مقابلے میں موصوف عام لوگوں، عصری علوم کے طلبا اور مادی توانائی و وسائل رکھنے والے افراد کو (اندازہ لگائیں کہ موصوف کے نزدیک مادی توانائی و وسائل کی کتنی زیادہ اہمیت ہے) اختیار دیے جارہے ہیں کہ دینی احکام وشریعت میں غور وفکر کرکے فیصلے کریں۔ کتاب مذکور میں بھی اور ان کی دیگر تحریروں میں بھی اس کی تلقین کی جارہی ہے۔ اب وہ لوگ جنھیں نہ دین کی کچھ شُدبُد ہے، حتیٰ کہ احکام شریعت کے مقاصد تو درکنار دینی احکام تک سے وہ ناواقف وانجان ہوں وہ دینی احکام میں کیا غور وفکر اور اجتہاد وفیصلہ کریں گے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ فرماتے ہیں:

> 'اجتہاد کرنا ان لوگوں کا کام نہیں ہے جو ترجموں کی مدد سے قرآن پڑھتے ہوں۔ حدیث کے پورے ذخیرے سے نہ صرف یہ کہ ناواقف ہوں، بل کہ اس کو دفتر بے معنی سمجھ کر نظر انداز کردیتے ہوں۔ پچھلی تیرہ صدیوں میں فقہائے اسلام نے اسلامی قانون پر جتنا کام کیا اس سے سرسری واقفیت بھی نہ رکھتے ہوں اور اس کو بھی فضول سمجھ کر پھینک دیں، پھر اس پر مزید یہ کہ مغربی نظریات واقدار کو لے کر ان کی روشنی میں قرآن کی تاویلیں کرنا شروع کردیں۔ اس طرح کے لوگ اگر اجتہاد کریں گے تو اسلام کو مسخ کرکے رکھ دیں گے اور مسلمان، جب تک اسلامی شعور کی رمق بھی ان کے اندر موجود ہے، ایسے لوگوں کے اجتہاد کو ہرگز ضمیر کے اطمینان کے ساتھ قبول نہ کریں گے۔ قوم کا ضمیر اس کو اس طرح اگل کر پھینک دے گا، جس طرح انسان کا معدہ نگلی ہوئی مکھی کو اگل کر پھینک دیتا ہے۔ مسلمان اگر اطمینان کے ساتھ کسی اجتہاد کو قبول کرسکتے ہیں تو وہ صرف ایسے لوگوں کا اجتہاد ہے، جن کے علم دین اور خداترسی اور احتیاط پر ان کو اطمینان اور بھروسا ہو اور جن کے متعلق وہ یہ

جانتے ہوں کہ یہ لوگ غیر اسلامی نظریات وتصورات کو اسلام میں نہیں ٹھونسیں گے۔'
(تفہیمات، حصہ سوم، ص: ۳۰)

اصول اجتہاد کے سلسلے میں مولانا فرماتے ہیں:

ان میں پہلا اصول یہ تھا کہ آدمی اس زبان کو اور اس کے قواعد اور محاوروں اور ادبی نزاکتوں کو اچھی طرح سمجھتا ہو جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ انگریزی زبان میں قانون کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں کیا ان کی تعبیر کا حق کسی ایسے شخص کو دیا جاسکتا ہے جو انگریزی زبان کی ایسی ہی واقفیت نہ رکھتا ہو؟ وہاں تو ایک کاما کے ادھر سے اُدھر ہو جانے سے معنی میں عظیم فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ حتی کہ بسا اوقات ایک کاما کی تبدیلی کے لیے پارلیمنٹ کو ایک قانون پاس کرنا پڑتا ہے، مگر یہاں یہ مطالبہ ہے کہ قرآن کی وہ لوگ تعبیر کریں گے جو ترجموں کی مدد سے قرآن سمجھتے ہوں اور ترجمے بھی وہ جو انگریزی زبان میں ہیں۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ آدمی نے قرآن مجید کا اور ان حالات کا جن میں قرآن مجید نازل ہوا ہے گہرا اور وسیع مطالعہ کیا ہو۔ کیا موجودہ قوانین کی تعبیر کا حق کسی ایسے شخص کو دیا جاسکتا ہے جس نے قانون کی کسی کتاب کا محض ترجمہ پڑھ لیا ہو؟ تیسرا اصول یہ ہے کہ آدمی عمل درآمد سے اچھی طرح واقف ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین کے دور میں اسلامی قوانین پر ہوا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ قرآن خلا میں سفر کرتا ہوا براہ راست ہمارے پاس نہیں پہنچ گیا۔ اس کو خدا کی طرف سے ایک نبی لایا تھا۔ اس نبی نے اس کی بنیاد پر افراد تیار کیے تھے، معاشرہ بنایا تھا، ایک ریاست قائم کی تھی، ہزار ہا آدمیوں کو اس کی تعلیم دی تھی اور اس کے مطابق کام کرنے کی تربیت دی تھی۔ ان ساری چیزوں کو آخر کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ ان کا جو ریکارڈ موجود ہے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر کے صرف قرآن سے احکام کے الفاظ لینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ چوتھا اصول یہ ہے کہ آدمی اسلامی قانون کی پچھلی تاریخ سے واقف ہو۔ وہ یہ جانے کہ یہ قانون کس طرح ارتقاء کرتا ہوا آج ہم تک پہنچا ہے۔ پچھلی تیرہ صدیوں میں صدی بہ صدی اس پر کیا کام ہوا ہے۔ پانچواں اصول یہ ہے کہ آدمی ایمانداری کے ساتھ

اسلامی اقدار اور طرز فکر اور خدا اور رسول کے احکام کی صحت کا معتقد ہو اور رہنمائی کے لیے اسلام سے باہر نہ دیکھے۔ بل کہ اسلام کے اندر ہی رہنمائی حاصل کرے۔ یہ شرط ایسی ہے جو دنیا کا ہر قانون اپنے اندر اجتہاد کرنے کے لیے لازمی طور پر لگائے گا۔' (تفہیمات سوم، ص: ۳۲،۳۱)

ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی بینک کے سود سے متعلق بھی ملائشیا کی کسی اسلامی امور سے متعلق کمیٹی کے فتویٰ کے حوالے سے فرماتے ہیں:

'امت کی تجارت وصنعت کی ترقی کی خاطر بینکوں کے قرضوں پر سود (دینا) ضرورت کی بنیاد پر جائز ہے۔ یہی اجازت بینکوں میں جمع رقوم پر سود لینے کے بارے میں بھی دی گئی ہے۔ اسلامی ادارے یا تجارتی کمپنیاں جن کے ممبران مسلمان ہوں ان کے بینکوں میں جمع سرمایوں پر جو سود ملے، اسے لینا اس حرج کی بنا پر جائز ہے جس میں آج کل مسلمانوں کی اقتصادیات مبتلا ہے۔ یہی معاملہ افراد کی جمع کردہ رقوم کا بھی ہے۔'

آگے کسی دوسرے فتویٰ کا حوالہ دے کر ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

'جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے، ہمیں اس سے بحث نہیں کہ کون سی رائے درست ہے اور کون سی نادرست، دیکھنا یہ ہے کہ بولتے ہوئے حالات سے نپٹنے میں معاصر فقہاء اور مفکرین مقاصد شریعت کی طرف کس طرح رجوع کرتے ہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ ایسے فیصلے کریں جن سے کچھ لوگوں کو اتفاق ہو اور کچھ کو اختلاف۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ملک کے متفق علیہ فیصلوں سے دوسرے ملکوں میں اختلاف کیا جائے۔' (مقاصد شریعت، ص: ۲۰۰،۱۹۹)

ایک فتویٰ کے ذریعے امت مسلمہ کے اقتصادیات کے مسئلے کے سبب مسلمانوں کے لیے بینکوں کا سود (لینا اور دینا دونوں بھی) جائز کر دینا اور دوسرے فتویٰ کے ذریعے ناجائز قرار دینا موصوف کے نزدیک دونوں صحیح ہے۔ یعنی نص قرآنی کے ذریعے حرام کردہ کسی امر کو کسی علاقے میں حرام ہی رہنے دیا جائے تو وہ بھی صحیح اور کسی علاقے میں حلال قرار دے دیا جائے تو وہ بھی صحیح۔ پھر یہ کہ اضطرار کی صورت میں کسی فرد کو اپنی کسی بنیادی ضرورت کی خاطر کسی وقت کچھ سود لینے کی گنجائش

نکالنے کا تو کسی کے بھی نزدیک سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح کہ زنا کو کسی صورت میں حلال نہیں کیا جاسکتا۔ اضطرار کی حالت میں بھی نہیں، اسی طرح سود لینے کا بھی مسئلہ ہے۔ کجا کہ ابتلاء اقتصادیات کے نام سے سود کو مطلقاً (لین دین سب) سب کے لیے حلال قرار دے دیا جائے۔

سود کا مسئلہ کیا فقہی مسئلہ ہے؟ فقہائے کرام کا حرام کردہ ہے یا خدائے تعالیٰ کا؟ مفادات ومصالح کے نام سے قرآن کے احکام کو الٹ دینا حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے دینا موصوف کے نزدیک مقاصد شریعت کا تقاضا ہے۔ یعنی اسلام کو بھی نام نہاد مقاصد شریعت کے عنوان کے تحت اسے 'لچکدار اور آسان' بنانے کے بہانے یہودیت وعیسائیت جیسا بنا دیا جائے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ایک مجلس میں فرمایا تھا:

> 'اسلام میں اس امر کی گنجائش اور صلاحیت تو پوری طرح موجود ہے کہ ہر دور میں نت نئے پیش آمدہ مسائل کو اسلامی اصولوں کے مطابق حل کیا جائے اور اس غرض کے لیے اسلام میں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے۔ لیکن اگر مقصد یہ ہو کہ ہر دور میں جنم لینے والے نظریات کو اسلامی ثابت کیا جائے اور کھینچ تان کر کے اسلام کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالا جائے تو یہی چیز کھلی ہوئی تحریف ہے۔ اسے اجتہاد یا تعبیر کا نام کیوں کر دیا جاسکتا ہے۔' (۵اے، ذیلدار پارک، حصہ سوم، ص:۱۵۱)

★★

توجہ طلب

ماہ نامہ 'زندگی نو' میں شائع ہونے والے مضامین اور مراسلوں میں حسب ضرورت تلخیص (Summarising) اور الفاظ وتراکیب کی تصحیح (Editing) کرنی پڑتی ہے۔ اہل قلم اور مراسلہ نگار بھائیوں اور بہنوں کی خدمت میں مودبانہ گزارش ہے کہ وہ اسے گوارا فرمائیں۔ بہ صورت دیگر ہماری معذرت قبول فرمائیں۔

(ادارہ)

Rs. 15/-
مارچ ۲۰۱۱ء
ماہ نامہ
زندگی نو
نئی دہلی
وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا
یہ سارے کے سارے قیامت کے دن اکیلے اس کے پاس حاضر ہونے والے ہیں۔ (سورہ مریم: ۹۵)